ادبی مصاحبہ:"حرف من وتو" کے تناظر میں

Litrary Interview:In context of "Harfe Mun o Tu"

محمد فاروق
(پی ایچ ڈی سکالر، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد)
ڈاکٹر ظفر حسین ہرل
(اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد)

Abstract:

Interview is an art and a tool of research (data collection, assessment and evaluation.) It is also used in psychoanalysis and catharsis. It exposes the human being's psychology and innerself. Normally two persons involves in an interview; interviewer and interviewee. It may be a panel interview or individual. Interviewer uses different tools to conduct an interview. Interview of literary personalities explore their biography, intellectual thoughts and literary aspects. Asif Farrukhi in "Harfe Mun o Tu" compiled interviews of different literary personalities of Urdu Literature. Litrary Interview is progressing to become a genre of literature. Interview is a useful and direct source of knowledge collected and interpreted by the interviewer. Reader can observe and collect biographical, historical, intellectual and literary knowledge and data.

Keywords: Interview, Biography, Intellect, Literature, History, Movements

کلیدی الفاظ: مصاحبہ، سوانح، فکر، ادب، تاریخ، تحریکیں

مصاحبہ ایک دلچسپ مکالمہ ہے جو قاری کی تشنگی کو کم کر کے اس کی فکر کو سیر اب کرتا ہے۔ یہ ایک فن ہے جو انسان کے داخل کو خارج پر ظاہر کرتا ہے۔ کسی ادیب سے مصاحبہ اپنے اندر کئی سوانحی اور فکری پہلو رکھتا ہے۔ یہ مصاحبہ نگار پر منحصر ہے کہ وہ کتنا ماہر ہے۔ ایک صحافی اور ایک ادیب صحافی میں بنیادی فرق ہے۔ بنیادی ادبی اصطلاحات کا علم، ادیبوں کی سرگرمیوں سے آگاہی، زبان و ادب کی تاریخ اور تحریکوں کی معلومات، ادب کے لسانی پہلو، ادبی تاریخ و شخصیات سے آگاہی، اسلوب اور اسلوبیات کے مباحث، جدید و قدیم تحقیقی زاویے اور نظریات اور تنقید کے متعلق کم از کم معلومات کسی ادبی شخصیت سے مصاحبہ کے لیے ضروری ہیں۔ ایک مصاحبہ نگار ماہرِ نفسیات کا کام بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے سوالات کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ مصاحب کی اندرونی کیفیت بدل جاتی ہے اور اس کی اندرونی اور بیرونی کیفیت اور کلام یکساں ہو جاتے ہیں۔ یہ یکسانیت شعور کی ایک رواں رو پیدا کرتی ہے۔ جس کے نتیجے میں کئی مناظر و افکار جنم لیتے ہیں۔

ایک ادیب کا مصاحبہ فکری اور فنی اعتبار سے اپنے اندر کئی پہلو سموئے ہوتا ہے۔ مصاحبہ میں مکالمہ، سوانح، تاریخ، علمی و ادبی افکار، دانش اور نفسیات پائے جاتے ہیں۔ یہ کسی فرد کی گفتگو تو ہوتا ہی ہے لیکن ایک قاری اس کے مختلف گوشوں سے خوشہ چینی کر سکتا ہے۔

''حرفِ من و تو'' مصاحبات کا مجموعہ ہے۔ جس میں آصف فرخی نے عصرِ حاضر کے 14 نمایاں ادبا کے مصاحبات کو شامل کیا ہے جو انہوں نے مختلف اوقات میں ان سے کیے۔ پاک و ہند کے ان ادبا میں غلام عباس، سلیم احمد، انتظار حسین، فیض احمد فیض، کشور ناہید، اختر حسین رائے پوری، ممتاز مفتی، جیلانی بانو، مظفر علی سید، محمد عمر میمن، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، شمس الرحمٰن فاروقی اور امرتا پریتم شامل ہیں۔

آصف فرخی خود بھی ایک افسانہ نگار، نقاد، شاعر اور مترجم تھے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں آتش فشاں پر کھِلے گلاب''، ''اِسم اعظم کی تلاش''، ''چیزیں اور لوگ''، ''شہر بیتی''، ''شہر ماجرا''، ''میں شاخ سے کیوں ٹوٹا''، ''اِیک آدمی کی کمی اور ''میرے دِن گذر رہے ہیں'' شامل ہیں۔ ''عالم ایجاد'' اور ''نگاہ آئینہ ساز میں'' ان کی تنقیدی مضامین کی کتب ہیں۔ اُنہوں نے آئن رینڈ، ہرمن ہیسے، گریش کرناڈ، ستیہ جیت رائے، اگنار زیو سلونے، ساتو کی زاکی، ارنستو ساباتو، عمر ریو ابیلا، نجیب محفوظ، ارون دھتی رائے، رفیق شامی اور کئی مصنّفین کے انگریزی متون ترجمہ کر کے اُردو میں منتقل کیے۔ خود بھی انگریزی میں مسلسل لکھا ہے۔ موضوعاتی انتخاب میں ممتاز شیریں کے تنقیدی مضامین ''منٹو نوری نہ ناری'' فسادات کے افسانوں پر مشتمل کتاب ''ظلمتِ نیم روز'' اور ''منٹو کا آدمی نامہ'' ان کے قابل رشک ادبی کارنامے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ ''دنیازاد'' کے ایڈیٹر تھے۔

''حرف من و تو'' میں شامل مصاحبات اور اصحاب اپنے اپنے میدان کے نمایاں کھلاڑی ہیں۔ افسانہ نگار، ناول نگار، شاعر، مترجم، نقاد اور محقق ہیں۔ ان مصاحبات میں کئی اخلاقی و ادبی افکار پوشیدہ ہیں۔ وہ کون سے افکار ہیں ان کو اخذ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ افکار ایک ادیب نے دوسرے ادبا سے براہِ راست حاصل کیے اور مصاحبہ کی صورت میں ان کو رقم کیا۔ آصف فرخی ان مصاحبات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ادبی انٹرویوز کا یہ سلسلہ۔۔۔لے کر ۱۹۸۹ء تک ان اہم اور پسندیدہ ادیبوں سے ملاقاتوں پر مبنی ہے جن سے باضابطہ طور پر ادب و فن کے حوالے سے سوال کرنے کا موقع ملا۔''(۱)

مصاحبہ ایک ادبی صنف ہے یا کچھ اور یا محض ایک آلۂ تحقیق۔ یہ ایک زیرِ بحث نکتہ ہے۔ اگر یہ ادبی صنف ہے تو اس کے لیے انگریزی لفظ انٹرویو کے متبادل کیا لفظ اختیار کیا جانا چاہیے۔ مصاحبہ، مکالمہ، گفتار یا کوئی اور لفظ اختیار کیا جائے۔ اس سوال کا جواب ہمیں آصف فرخی کے غلام عباس سے لیے گئے انٹرویو میں ملتا ہے۔ اس انٹرویو میں غلام عباس کہتے ہیں:

"مجھے نقادوں کی اس تگ و دو سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں کہ آیا انٹرویو ایک نئی ادبی صنف ہے یا کسی پُرانی صنف کی نئی شکل یا ان سب سے الگ کوئی اور چیز۔۔۔ ادبی انٹرویو کے لیے فی الوقت اردو لغت میں کوئی موزوں لفظ اگر رائج نہیں ہے کہ اسے کیا کہا جائے مصاحبہ؟ مکالمہ؟ یا کچھ اور۔۔۔ جب انٹرویو دینے والا ایک ادیب ہو تو ہمیں ایک اور امکان مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ ادیب جب بھی الفاظ استعمال کرتا ہے ادب کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔"(۲)

ادبی مصاحبہ ادبی افکار کی وضاحت کرتا ہے۔ ادب معاشرے کا آئنہ ہوتا ہے۔ معاشرے مختلف عمرانی و مدنی اصول و ضوابط اور رسوم رواج کا پابند ہوتا ہے۔ یہ قواعد اور رسوم کہیں بھی تحریری صورت میں دستیاب نہیں ہوتے۔ جب ادب ان رسوم رواج کو بیان کرتا ہے تو ان کے مثبت اور منفی پہلو واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ اسی طرح اردو ادب کی جملہ اصناف میں ادبا نے کئی عمرانی، تہذیبی، مذہبی، سائنسی، فنی، تاریخی، طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی، نفسیاتی اور ماورائے نفسیات مباحث کو نظم و نثر کا حصہ بنایا ہے۔ انہیں موضوعات سے متعلق مصاحبہ کاروں نے ادبا سے متعدد حقائق کی چشم کشائی کروائی ہے۔ ڈاکٹر طاہر مسعود "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" میں لکھتے ہیں:

"میں نے روزنامہ "جسارت" میں آج سے تین ساڑھے تین سال قبل ادبی انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا جو خلاف توقع بہت مقبول ہوا۔ ان انٹرویو سے نئی دلچسپ بحثیں چھڑیں، دلچسپ ادبی و غیر ادبی تنازعات نے جنم لیا۔۔۔ ان انٹرویو میں تین قسم کے موضوعات مشترک ہیں۔ ایک تو نام اور ادیبوں سے ان کی شخصیت اور فن کے متعلق مختلف زاویوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے ادب اور عصری مسائل کے حوالے سے نئی بحثیں چھیڑی گئی ہیں۔ تیسرے ادبی تحریکات کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔"(۳)

اردو کے تین ادبا (وقار عظیم، الطاف حسن قریشی، سجاد میر) نے انٹرویو کو ملاقاتی خاکے کہا ہے۔ ۲۳ مصاحبات پر مشتمل الطاف حسن قریشی کی تصنیف "ملاقاتیں کیا کیا" میں سجاد میر لکھتے ہیں:

"الطاف صاحب نے خود ان انٹرویوز کو ملاقاتی خاکے کہا ہے۔ غالباً یہ ترکیب پہلی بار ان کے لیے اردو کے ممتاز نقاد وقار عظیم نے استعمال کی تھی۔ یہ اصطلاح ان کے انداز اور اسلوب کا نچوڑ ہے۔"(۴)

اردو افسانہ انگریزی ادب سے ماخوذ صنف ہے۔ اس میں ادیب مختلف تکنیکوں سے کسی ایک پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ اور بسا اوقات خیال آرائی افسانہ کی شکل کو اتنا خوبصورت بنا دیتی ہے کہ آدمی اس میں کھو جاتا ہے۔ غلام عباس ایک بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے مشہور افسانوں میں آنندی، اوور کوٹ، کتبہ، یہ پری چہرہ

لوگ، بہروپیا، گوندنی، کن رس، بندر والا اور تنکے کا سہارا ہیں۔ افسانہ کیا ہے؟ اس کے لیے کن اجزا کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کیسے تشکیل پاتا ہے، اپنے انٹرویو میں غلام عباس کہتے ہیں:

"پہلے میں یہ بتاتا ہوں کہ افسانہ کتنا بلند ہے، اس کا مقام کیا ہے، ادب میں شاعری پہلے نمبر پر ہے، اس کے بعد افسانہ آتا ہے۔ یہ نہایت compact چیز ہے۔ افسانہ لکھنے کے لیے اصل میں صرف مشاہدہ ہی کافی نہیں ہوتا۔ آپ نے کوئی چیز لکھی اور جوں کی توں بیان کر دی تو وہ رپورٹنگ ہو گئی۔ افسانہ لکھنے میں خیال آرائی کی بڑی ضرورت ہوتی ہے، جو آپ کو مواد ملا ہے مشاہدے سے اس سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔"(۵)

افسانہ لکھنے کے لیے کس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ انسانی زندگی کے بے شمار پہلو پوشیدہ ہیں۔ انسان ہی انسان کے متعلق کم جانتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ رہنے والوں کے ہی مختلف چہرے دیکھتا ہے تو انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ افسانہ میں جامعیت، اختصار اور ایجاز خوبصورتی پیدا کرتے ہیں۔ افسانے کا آغاز اور اختتام اچانک ہی ہوتا ہے۔ افسانہ کے لیے خیال آرائی، مشاہدہ، ذخیرہ الفاظ اور خزانۂ معلومات میں کیا فرق ہے؟ فلابیر اور موپساں کی گاڑی بانوں والی مثال دے کر غلام عباس کہتے ہیں:

"افسانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز ہے کہ اس کو زندگی کا ایک ایسا پہلو نظر آجائے جو عام لوگوں کی نظروں سے چھپا ہوا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ دماغی اختراع کو بھی دخل ہے یعنی وہی خیال آرائی۔ بعض لوگ افسانے میں طوالت پیدا کرنے کے لیے غیر ضروری تفصیلات اور جزئیات کی بھر مار کر دیتے ہیں تاکہ لوگ یہ کہہ سکیں کہ دیکھو اس کا مشاہدہ کتنا وسیع ہے مگر یہ مشاہدہ نہیں ہے، کیٹلاگ ہے۔"(۶)

ناول اور افسانے میں کیا بنیادی فرق ہے۔ ان کے پھیلاؤ کی حدود کیا ہیں؟ غلام عباس کے مصاحبہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ مغربی افسانہ نگاروں سے متاثر ہیں اور انہوں نے کچھ افسانے ان کے تتبع میں لکھے جیسے اوور کوٹ۔ البتہ انہوں نے اس کو پہلو بدل دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ "میرا اوور کوٹ دوسرا ہے۔ اسی طرح ان کے افسانے "آنندی" کا روسی، جرمن، جاپانی، چینی، انگریزی، زیک، عربی، فارسی، ترکی، سواحلی، ملائی، بنگالی، مراٹھی اور ہندی میں ترجمہ ہوا۔" ناول اور افسانے کی اس بحث میں "وار اینڈ پیس" اور "سلامبو" کا تذکرہ کرتے ہوئے غلام عباس افسانے کی کینوس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

"اس کے مقابلے میں افسانے کا کینوس چھوٹا ہوتا ہے۔ اس میں آپ ایک ہی خیال کو ظاہر کرتے ہیں اور ایک ہی بات پر آپ کی توجہ مرکوز رہتی ہے۔ اس میں آپ واقعات یا احساسات کی شدت پیدا کر

سکتے ہیں اور پڑھنے والوں کو اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیتے اور ایک ہی نکتہ ہوتا ہے جس کو کمال پر پہنچا دیتے ہیں۔"(۷)

ادبی مصاحبات میں جہاں پر ادبی اصناف کی بحث پر مبنی ہوتے ہیں وہیں سماجی مسائل اور نظریات و افکار پر بھی بات کی جاتی ہے۔ اردو افسانے پر ایک بڑا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اس میں کچھ افسانہ نگار فحش نگاری کرتے ہیں۔ جیسے منٹو اور عصمت چغتائی وغیرہ۔ اس اعتراض کے حوالے سے سلیم احمد کا ایک جواب قابلِ غور ہے۔ ادب میں عریانی اور فحاشی پر ایک سوال کے جواب میں وہ کہتے ہیں:

"۔۔۔ میں کہتا ہوں کہ اپنے الفاظ کا مطلب واضح کرو، اپنی terms کو define کرو۔ فحش کہتے کس کو ہیں، یہ تم مجھے بتاو جنس کا بیان ہر حالت میں فحش نہیں ہوتا۔۔۔ ورنہ طب اور فقہ اور مختلف علم میں جو جنس کا بیان ہے وہ سب فحش ہو جاتا۔ اب فحش کیا چیز ہے۔ اس کی تعریف مجھے بتایئے اور جن چیزوں کو فحش آپ کہتے ہیں ان میں بتایئے کہ اس میں یہ چیز فحش ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ آرٹ اپنی فطرت کے اعتبار سے فحش نہیں ہو سکتا کیوں کہ آرٹ کا کام جذبات کر بھڑکانا نہیں، جذبات کی تہذیب کرنا ہے۔ فن فحش ہو ہی نہیں سکتا جس وقت تک وہ فن ہے۔ جس وقت وہ آرٹ کے منصب سے گر جائے گا وہ فحش بھی ہو سکتا ہے، وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ اور یہ ہو سکتا ہے کہ آپ سر سے پاوں تک جسم ڈھک کر فحش کام کریں۔"(۸)

سلیم احمد اردو ادب کے اہم مفکر، دانشور، شاعر اور نقاد تھے۔ ان کے ۵ شعری مجموعے، ۶ تنقیدی کتب، ۲ مضامین کے مجموعے شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ ہفت روزہ "زندگی"، ہفت روزہ "تعبیر"، روزنامہ "جسارت" اور روزنامہ "حریت" میں مستقلاً کالم لکھتے رہے۔ سلیم احمد کے افکار کی اردو ادب اور ادبا کے افکار پر گہری چھاپ ہے۔ نظام زندگی، سماجی افکار، معاشرتی رسوم و رواج اور عمرانی معاہدات پر ان کی گہری نظر ہے۔ ادب کا معاشرے میں کیا کردار ہونا چاہیے کا جواب ان کے متعدد انٹرویوز میں ملتا ہے۔ معاصر علمی و ادبی منظرنامے کے ساتھ عالمی نظریات کے ٹکراؤ اور پھیلاؤ کو وہ غیر جانبداری کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ معاشرے میں مادہ پرستی کے رجحان اور فکری سطحیت اور اس میں ادب کے کردار پر ان کے مصاحبات میں ہماری تشنگی دور ہو جاتی ہے۔ آصف فرخی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں ایک سوال کے جواب میں وہ کہتے ہیں:

"سلیم احمد: میرے خیال میں پہلے اگر ادب ایک شوق تھا اور اس کے جواز کی تلاش ہوتی تھی، یا آپ کہیں کہ وہ ایک مشغلہ اگر تھا تو اب وہ لازمہ ہو گیا ہے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ۔۔۔ ہمارا معاشرہ ایسا نہیں ہے اور ہمارے معاشرے میں انھیں چیزوں کی وجہ سے جو تم نے بیان کیں یعنی مادہ پرستی اور فکری گہرائی کا فقدان تو ان کی وجہ سے لازم ہو گیا ہے کہ ادب ایک parallel distinction کے

طور پر زندہ رہے یہ money-minded ہونے کے معنی کیا ہیں صاحب؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ میرا صوفہ مجھ سے اہم ہو یا ٹی وی زیادہ اہم ہو، میرا مکان مجھ سے اہم ہے، میری کرسی مجھ سے زیادہ اہم ہے،۔۔۔ ادب میں خود آگہی کی ایک روایت ہے۔ جب تک ادب کا مرکز انسان نہ ہو، زندگی نہ ہو وہ ادب نہیں ہوتا۔۔۔ جہاں انسان اشیا سے کم تر درجے کا ہو گیا ہو بلکہ لاشہ محض بن گیا ہو، اس کے اندر ادب کو باقی رکھنا زندگی کی قوتوں کی پرورش کے مترادف ہے، ایک حیاتیاتی ضرورت ہے۔"(۹)

کیا ادب فکری طور پر بالکل ہی آزاد ہے یا اس پر کچھ قدغنیں لگانا ضروری ہوتا ہے۔ ادیب خواہ اس کا تعلق کسی بھی معاشرے، تہذیب یا مملکت سے ہو، اسے کس حد تک لکھنے کی اجازت ہے اور کہاں پر جا کر اسے علامت و استعارے سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس پر ادبی دنیا میں کئی مباحث موجود ہیں۔ ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی اور ادب برائے مقصد کے نظریات نے ادب کے دائرے قائم کر دیے ہیں۔ کچھ ادیب ان دائروں سے بھی باہر ہیں۔ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کیا ہے؟ رومانیت اور حقیقت نگاری کی اصطلاحات نے ادب کی کیا خدمت کی ہے؟ مصاحبہ ادبا سے ایسے ہی مباحث کے جوابات کو براہ راست اخذ کرتا ہے اور قاری کے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ انتظار حسین ایسے مباحث پر ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"۔۔۔ آرٹ پر ان کے جو مضامین ہیں جو اسی زمانے میں لکھے گئے تو مجھے تو یہ احساس ہو رہا تھا اس وقت بھی اور اب بھی کہ وہ اس ملک میں ایک ایسے آرٹ اور ادب کی روایت قائم کرنا چاہتے تھے جس کے دریچے بالکل کھلے ہوئے ہوں، مغرب سے بھی ہوائیں آ رہی ہوں، مشرق کی جو پرانی تہذیبیں ہیں ان سے بھی استفادہ کر رہی ہو۔ لیکن سفر کرتے کرتے جس طریقے سے ہم دوسری سطحوں پر تنگ نظری کا شکار ہوتے چلے گئے اور تعصب کا اور ایک puritanism اور ایک نہایت محدود قسم کے اور متعصب قسم کے جو نظریات ہمارے یہاں فروغ پاتے چلے جا رہے ہیں ان ہی کا شکار یہ پاکستانی ادب کا تصور بھی ہو گیا ہے تو اس حوالے سے تو آپ مجھے دیکھیے ہی نہیں۔"(۱۰)

ادب زندگی کا عکس ہے، تو زندگی میں حقیقت بھی ہے اور رومان بھی ہے۔ سامنے نظر آنے والے انسان کا ایک داخل ہے اور ایک خارج بھی ہے۔ انسان بغیر تخیل کے روبوٹ ہے۔ اس کے خواب بھی ہیں، خیالات بھی ہیں، سوچ بھی ہے، شعور، لاشعور اور تحت الشعور بھی ہے۔ اس میں ہر طرح کی بھوک بھی ہے اور ہوس بھی ،خواہ وہ دولت کی ہے یا جنس کی۔ دوسری طرف افلاس ہے، غربت ہے، زندگی تنگ ہے اور انسان مشین ہے ۔ جس بھی تصویر کو دیکھتے ہیں اس میں موجود زندگی کی رنگا رنگی سے رخ موڑا نہیں جا سکتا۔ یہ رنگ اچھا بھی ہے

اور برا بھی۔ اسی طرح ہر انسانی معاشرہ اپنی مخصوص اقدار وروایات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ایسے میں ادیب کیسے ادب تخلیق کرتا ہے ؟وہ کیا سوچتا ہے ؟کیا وہ مخصوص دائرے میں رہ کر لکھتا ہے یا لکھتے ہوئے اس کا تخیل قلم کو رواں رکھتا ہے۔ وہ منتشر خیالات اور اعلیٰ تخیل کا تانا بانا کیسے بُنتا جاتا ہے، پلاٹ کو منظم کرتا ہے اور اسلوب کی قوت کو بھی قائم رکھتا ہے۔

۱۹۳۰ء کی دہائی میں حقیقت نگاری اور بعد ازاں تجریدیت نے اردو افسانے کو نیا رنگ دیا۔ تجریدی افسانے میں خارج کے بجائے داخل (ذہنی مسائل، انتشار ذات، اور عرفان ذات) پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہ افسانے انسان کی داخلی اور نفسیاتی کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ اس میں تکنیکی طور پلاٹ یا تو سرے سے ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا ہے تو ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قسم کے افسانوں میں انتظار حسین کے افسانے 'آخری آدمی' اور 'کایا کلپ'، انور سجاد کے افسانے 'مرگی'، 'چوراہا'، 'کونپل'، 'گائے'، 'پرندے کی کہانی' اور غلام الثقلین نقوی کے افسانے 'لمحے کی موت' اور 'وہ سرگوشی' شامل ہیں۔ تجریدی افسانہ کے موضوعات میں کرپشن، تنہائی، دہشت گردی، مشینی زندگی اور اخلاقی قدروں کی گراوٹ وغیرہ منتخب کیے جاتے ہیں۔ تجریدی افسانے کے بارے میں گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> ''تجریدی افسانہ ہمارے افسانے کے اس سفر کی نشاندہی کرتا ہے جس کا رخ خارج سے داخل کی طرف ہے، یہ انسان کے ذہنی مسائل، اس کے کرب اور حقیقت کے عرفان کی تلاش کا اظہار ہے۔ وہ بھی صرف فکر یا ذہنی سوچ کی سطح پر۔ افسانہ علامتی ہو یا تجریدی، اس میں لغوی معنی صرف ایک طرح کر اشارہ کر دیتے ہیں، باقی کام پڑھنے والوں کی ذہنی استعداد کا ہے۔''(۱۱)

اردو افسانے میں تجریدیت کے رجحان اور سماجی حقیقت پسندی کے رد میں انتظار حسین کا نام لیا جاتا ہے۔ وہ علامتیت اور تجریدیت کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ حقیقت نگاری اور تجریدیت کے متعلق آصف فرخی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں وہ ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں:

> ''جب کوئی نیا رجحان آتا ہے، بہت سی وجوہات ہوتی ہیں اس کے سارے عمل میں سے ایک نئی چیز جنم لیتی ہے لیکن جب میں نے اس قسم کی کہانیاں لکھنی شروع کیں اور مجھے احساس ہوا کہ میرا اسلوب بدل گیا ہے تو مجھے ساتھ ساتھ یہ بھی احساس تھا کہ یہ حقیقت نگاری کا جو اسلوب ہے بہر حال ایک اسلوب ہے اور اسے بالکل مسترد تو نہیں کیا جا سکتا تو آپ میری ان کہانیوں میں بھی دیکھیں گے کہ ایک تجریدیت بھی ہے، علامت بھی ہے لیکن میں کوشش کرتا ہوں کہ یہ حقیقی زندگی کی سطح جو ہے ،وہ کہیں نہ کہیں رہنی چاہیے۔۔۔''(۱۲)

اختر حسین رائے پوری ترقی پسند تحریک کے پیش روؤں میں سے تھے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ان کا شمار نمایاں افراد میں سے تھا۔ وہ ایک مترجم، نقاد اور افسانہ نگار تھے۔ ان کے ۵ تراجم، ۳ افسانوی مجموعے، ایک تاریخ، ۲ تنقید اور ایک خود نوشت پر مبنی تصانیف ہیں۔ وہ اردو، انگریزی، بنگالی، سنسکرت اور فرانسیسی زبانیں جانتے تھے۔ اختر حسین رائے پوری نے افسانہ نگاری کے اسلوب اور تکنیک میں متعدد تجربات کیے۔ بحیثیت ترقی پسند افسانہ نگار اپنے افسانہ نگاری کے تجربے کے متعلق اختر حسین رائے پوری کہتے ہیں:

> ''بہر حال ان افسانوں میں، میں نے جو کام کیا ہے اور آپ بھی یہ محسوس کریں گے کہ میں نے خاصے تجربے کیے ہیں، اسلوب میں بھی اور تکنیک میں بھی۔ ان میں بعض کہانیاں ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کی حامل ہیں اور غالباً اردو میں پہلی ترقی پسند تحریر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے بعض کا ترجمہ یورپی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ''محبت اور نفرت'' کی بعض ابتدائی کہانیاں رومانوی انداز کی ہیں۔۔۔''(۱۳)

مصاحبہ نگار کے سوالات مصاحب کو اپنے ماضی کی جھلک دکھاتے ہیں اور ادبی تاریخ کے واقعات اس کے ذہن کے پردے پر رونما ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک ادیب اپنی تخلیق پر بھی نظر ثانی کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں قاری کی رائے ادیب کی رائے پر بھی اثر انداز ہوتی ہو۔ وقتِ تخلیق مصنف کچھ اور سوچ رہا ہوتا ہے اور بعد از تخلیق قاری اور نقاد کی رائے مصنف کی رائے (اپنی تخلیق کے متعلق) پر بھی اثر انداز ہو۔

ادب اور علمِ نفسیات ایک دوسرے سے کافی حد تک منسلک ہیں۔ شعور، لاشعور، تحت الشعور، شعور کی رو، فلیش بیک، کتھارسس، تحلیلِ نفسی، خودی، انا اور ایڈیپس کمپلیکس وغیرہ جیسی علمِ نفسیات کی اصطلاحات افسانوی و غیر افسانوی نثر اور نظم میں استعمال ہوتی ہیں۔ ماہرین علم نفسیات فرائڈ اور یونگ کے نظریات بھی اردو ادب میں آزمائے گئے ہیں، خاص طور پر فکشن میں۔

ممتاز مفتی ایک مختلف الجہت افسانہ نگار تھے۔ ممتاز مفتی کے افسانے نفسیاتی پیچیدگیوں اور لاشعور کی پر اسرار بھول بھلیوں میں گم ہوتے تھے۔ ان کے ناول ''علی پور کا ایلی'' تحلیلِ نفسی کا خوبصورت شاہکار ہے۔ ازاں بعد ممتاز مفتی کے افسانے نے ایک اور کروٹ لی اور اس میں تصوف در آیا۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے نفسیات، ماورائے نفسیات (Parapshychlogy) اور جنس کے ذریعے انہوں نے انسان کے بنیادی سوالات کے جوابات تلاش کرنے کوشش کی۔ اس کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے مصاحبہ میں وہ کہتے ہیں:

> ''۔۔۔ میں نفسِ لاشعور کی بات کرنا چاہتا تھا کہ نہ میں بات کروں، نہ میرا کردار بات کرے اور پڑھنے والا اس بات کو پالے کہ بات کیا ہے اور نفسِ لاشعور کی کون سی trend ہے جس کے تحت یہ کام کیا ہے تو یہ مشکل تھا۔ ایک دو مجموعے تو چل گئے پھر اس کے بعد نہیں چلے مگر پھر اس کے بعد سیدھی

نفسیات میں آ گیا پھر جنس میں چلا گیا۔ لوگوں نے اعتراض کیا جو فرائیڈ کی کیس ہسٹریاں ہیں، ان پر کہانیاں لکھتا ہے۔"(۱۴)

"حرف من و تو" میں خاتون افسانہ نگار جیلانی بانو کا مصاحبہ بھی شامل ہے۔ جس میں ان کی اردو افسانہ کے مختلف نظریات، افسانہ کے اسلوب اور پلاٹ سے متعلق گفتگو شامل ہے۔

افسانے کی تنقید کے حوالے سے ایک معتبر نام مظفر علی سید سے ایک مصاحبہ "حرف من و تو" کی زینت ہے۔ مظفر علی سید کا مصاحبہ کافی تفصیلی ہے۔ انہوں نے فکشن پر تنقید، حسن عسکری کی افسانے پر تنقید، اردو افسانے پر مغرب کے اثرات، اردو داستان ، حقیقت پسندی ، واقعیت، مافوق الواقعیت، مابعد الطبیعیات ، تجریدیت، علامتیت، ساختیات، متنی تنقید، شعور کی رو پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح محمد عمر میمن نے بھی اپنے مصاحبہ میں فکشن اور ترجمے کے کچھ تکنیکی امور پر روشنی ڈالی ہے۔ "حرف من و تو" میں آصف فرخی کو دیے گئے انٹرویو میں مظفر علی سید کہتے ہیں:

"۔۔۔ایک تو عسکری صاحب کی ادبی تربیت میں چوں کہ واقعیت کا دخل بہت زیادہ ہے یعنی realism اور اس کے جو بھی مکاتب اس وقت تک کام کر رہے تھے اور جن میں مافوق الواقعی قصے کی گنجائش بہت کم تھی۔۔۔ مگر طلسم کو وہ کسی مابعد الطبیعیاتی سطح پر قبول نہیں کر سکتے تھے۔۔۔ جیسا بھی مافوق الواقعی حصہ آ گیا ہے از خود بعض کہانیوں کے اجزا انھوں نے منتخب کیے ہیں اور انھوں نے یقینی طور پر کم سے کم رکھا ہے۔۔۔ نہ لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یا کم سے کم اسے انھوں نے عمل میں نہیں آنے دیا۔"(۱۵)

جدید افسانہ نگاری میں تجریدیت، علامتیت اور معنویت پر تنقید کرتے ہوئے مظفر علی سید کہتے ہیں:

"۔۔۔بہر حال، نئے افسانے نگاروں کے یہاں جو اصرار معنویت پر ہے، اسے کسی نے Abstraction کا نام دیا ہے، کسی نے Symbolism کا نام دیا ہے مگر در حقیقت وہ فنی فکشن کا ایک لازمہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور تجارتی، صنعتی فکشن سے جو اس کا نقطہ امتیاز ہے وہ اس کی گہرائی اور معنویت ہے۔۔۔ اگر اسلوب کی کچھ ندرتیں ہیں تو وہ بھی ایسی ہیں کہ جو چھو کر لکھی جا سکتی ہیں۔ ایک کھردرا پن آپ کو ورق پر پھیلا ہوا نظر آتا ہے، بعض لفظ ابھرے ہوئے لگتے ہیں۔۔۔ مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اسلوب کی under the skin گہرائی میں کوئی چیز ان لمسی یا سطحی خصوصیات سے زیادہ ہونی چاہیے اور اسی کا نام معنویت ہے۔"(۱۶)

ساختیات اور پس ساختیات دورِ حاضر کا اہم موضوع ہے۔ گوپی چند نارنگ کی 'ساختیات، پس ساختیات اور مغربی شعریات'، ڈاکٹر وزیر آغا کی 'معنی اور تناظر' اور ناصر عباس نیر کی 'جدید اور مابعد جدید تنقید' اس

موضوع کا سیر حاصل احاطہ کرتی ہیں۔ مظفر علی سید بھی ساختیات کے متعلق اپنی الگ رائے رکھتے ہیں۔ وہ اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں:

> "ایک کو تو آپ کہہ لیجیے thematic structures اور دوسرے ہیں stylistic structures۔ پہلی قسم کے اسٹرکچرز کی مثال میں کسی حد تک نارنگ صاحب کے بعض مضامین کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر بیدی والا مضمون ہے ان کا۔ تو یہ سبک شناسی کے حوالے سے لکھے جانے والے چند ایک مضامین ہیں جن میں thematic اسٹرکچرز کی کچھ کنسٹرکشن پائی جاتی ہے ۔زیادہ تر stylistic structure پر توجہ ہے کہ narrative جو ہے، مثلاً وہ کیسے لکھا جاتا ہے، narrative میں tense کی کیا اہمیت ہے؟ اس میں ضمیر کی یا فعل کی کیا اہمیت ہے؟ یہ کچھ مثالیں خود بنا کر پیش کرتا ہے، لکھنے والا اور کچھ فکشن سے چن لیتا ہے، مگر یہ اسلوبیاتی تجزیہ جو ہے یہ زیادہ سے زیادہ ہمیں یہ بات تسلیم کرا سکتا ہے کہ فکشن لکھنے والے نے زبان کا استعمال کتنی ذمہ داری کے ساتھ کیا۔۔۔ یہ جو اسٹرکچرل کرٹسزم ہے جیسے "آدھا آدمی" ہمارے سلیم احمد کو کہا کرتے تھے۔ یہ آدھے آدمی کی تنقید ہے۔"(۱۷)

مصاحبہ یا انٹرویو جہاں مصنف سے براہ راست استفادے کا نام ہے وہاں کچھ قباحتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ مصاحبہ نگار پر منحصر ہے کہ وہ ان قباحتوں سے احتراز کرے اور مصاحبہ کو منشائے مصاحب کے مطابق پیش کرے۔ 'حرف من و تو' میں شامل مصاحبات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مصاحبہ نگار خود بھی ایک صاحب اسلوب ادیب ہیں اور ادب اور مصاحبہ کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں۔ سوالات مرتب کرتے ہوئے اور فی البدیہہ سوالات کرتے ہوئے بھی وہ قاری کی ذہنی سطح کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ مصاحب کو بھی زچ نہیں کرتے اور ہلکے پھلکے انداز میں سوالات کرتے چلے جاتے ہیں۔ 'حرف من و تو' میں آصف فرخی نے پیش گفتار میں انٹرویو کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے اور مصاحبہ کے فنی لوازمات بھی بیان کیے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ آصف فرخی: ”حرف من وتو(لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۵،)ص ۲۰

2۔ ایضاً، ص۲۱

3۔ طاہر مسعود، ڈاکٹر: ”یہ صورت گر کچھ خوابوں کے (کراچی: ہما پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۷،)ص ۱۰

۴۔ الطاف حسن قریشی: ”ملاقاتیں کیا کیا!(لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۷،)ص ۲۷

۵۔ آصف فرخی: ”حرف من وتو“، ص ۲۴

۶۔ ایضاً، ص۲۹۔۲۸

۷۔ ایضاً، ص۲۵

۸۔ ایضاً، ص۴۱

۹۔ ایضاً، ص۴۲

۱۰۔ ایضاً، ص۵۷

۱۱۔ گوپی چند نارنگ: ”فکشن شعریات: تشکیل و تنقید (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹،)ص ۲۵۱

۱۲۔ آصف فرخی: ”حرف من وتو“، ص ۶۲

۱۳۔ ایضاً، ص۱۰۶

۱۴۔ ایضاً، ص۱۱۷

۱۵۔ ایضاً، ص۱۵۶

۱۶۔ ایضاً، ص۱۵۸۔۱۵۹

۱۷۔ ایضاً، ص۱۶۰۔۱۶۱